© rasailojaraid.com

محمد حنیف ندوی

مرحوم کی کچھ خوبیاں

کچھ لوگ پیدائشی طور پر عظیم شخصیت کے مالک ہوتے ہیں۔ کچھ لوگوں کو ذاتی جد و جہد سے عظمت کے بامِ رفیع تک رسائی حاصل ہوتی ہے۔ اور کچھ حضرات ایسے ہوتے ہیں کہ جن کی عظمت اکثر حالات و اتفاقات کی سازگاریوں کی رہینِ منت ہوتی ہے۔ خلیفہ صاحب کا شمار پہلی اور دوسری صف میں ہوتا ہے۔ انھوں نے جہاں فطرت سے عالی ظرفی کی نعمت پائی وہاں کسب و اکتساب میں بھی کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔ واقعہ یہ ہے کہ اس جامعیت کے انسان دنیا میں بہت کم پیدا ہوتے ہیں جو بیک وقت متفکر بھی ہوں اور خوش گفتار اور خوش مذاق بھی۔ جن میں تصوف و فلسفہ کا امتزاج نہایت متوازن ہو۔ جو مشرق کے مذاقِ سخن سے بھی آشنا ہوں اور مغرب کی سحر طرازیوں سے بھی اسی انداز سے آگاہ۔ جنھوں نے ٹینی سن اور حافظ کے جام و سبو کو ٹکرا کے دیکھا ہو اور دونوں سے یکساں استفادہ کیا ہو۔ اس وسعت اور خوبی کے انسان روز روز کب عالمِ فانی میں رونق افروز ہوتے ہیں۔ علم و فضل سے قطع نظر، اخلاقی اعتبار سے بھی خلیفہ صاحب کا پایہ بہت اونچا تھا۔ ایک خاص ادا ان کی یہ تھی کہ کسی شخص میں اگر خوبی دیکھتے تو اس کی بے حد تعریف کرتے اور سراہتے، اگرچہ وہ شخص مرتبہ و منزلت کے اعتبار سے کہیں کم درجہ کا ہو۔ چنانچہ اپنے ایک ملازم کی دیانت داری اور صفاتِ حمیدہ کے اس درجہ قائل تھے کہ اس کو برملا اخلاقیات میں اپنا استاد مانتے۔

اپنے رفقائے ادارہ پر جان چھڑکتے تھے اور ان کی صحبت و رفاقت کو حاصلِ زندگی قرار دیتے تھے۔ جس کا نتیجہ یہ تھا کہ روزانہ گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ جب تک مختلف موضوعوں پر ان سے جم کر بات چیت نہ کر لیتے اور کسی کام کی طرف متوجہ ہی نہ ہوتے۔ یا یہی نہیں اس گفتگو کو اس درجہ اہم سمجھتے تھے کہ اس میں مشکل ہی سے ناغہ ہوتا۔ کئی بار ایسا ہوا کہ گورنر جی جی اور بڑے بڑے وزراء سے طویل ملاقاتیں ہوئیں مگر ان کے ذوق و فکر کی تسکین نہ ہو سکی۔ اس لیے ان سے نمٹ کر سیدھے ادارے میں آئے اور جب تک رفقاء سے اپنے ڈھب کی باتیں نہ کر لیں گھر نہیں جا سکے۔ ایک قابلِ تعریف وصف ان کا یہ تھا کہ کسی دوست کو تکلیف میں نہیں دیکھ سکتے تھے۔ ہمارے ایک ندوی بھائی جن سے خلیفہ صاحب صرف ایک ہی مرتبہ ملے تھے اور وہ بھی سرسری طریق سے اتفاق سے ہندوستان چلے گئے۔ واپسی میں مشکلات پیش آئیں۔ انھوں نے خلیفہ صاحب کو لکھا کہ میرے بچوں کو براہِ کرم ایک صد روپیہ بھیج دیجئے۔ خلیفہ صاحب نے خط پڑھا تو بغیر ادنیٰ تامل کے یہ رقم ان کے بچوں کو بھجوا دی۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اکثر ایسا ہوتا کہ بجٹ کے منظور ہونے اور وصول ہونے میں دیر ہو جاتی اور ہمیں تشویش لاحق ہوتی کہ تنخواہوں کا کیا ہوگا اور روزمرہ مصارف کی گاڑی کیونکر چلے گی۔ خلیفہ صاحب سے ذکر ہوتا تو وہ اپنے حساب میں سے چیک کاٹ دیتے اور ہماری تمام تشویشوں کو چشم زدن میں دور کر دیتے۔

اللہ تعالیٰ پر ان کے ایمان کا یہ عالم تھا کہ ہم نے آٹھ دس برس کی رفاقت میں ان کو کبھی مایوس اور پریشان نہیں دیکھا اکثر کہا کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ سے ہمارا یہ سمجھوتا ہے کہ ہم حتی الامکان حرص و آز کے دائروں کو وسیع نہیں ہونے دیں گے اور وہ ہماری ضروریات کو بہرحال پورا کرتا رہے گا۔

فلسفیانہ اصطلاح میں وہ رجائی (OPTIMISTIC) تھے۔ قنوطی (PESSIMISTIC) ہرگز نہیں تھے اکثر دونوں مدرسہائے خیال میں موازنہ کرتے اور کہتے کہ جہاں تک دھوکا کھانے اور نقصان برداشت کرنے کا تعلق ہے رجائی اور قنوطی کی اس میں کوئی تخصیص نہیں۔ نہ رجائی کی رجا پسندی کو اس سے مفر ہے اور نہ قنوطی کی یاس پسندی ہی اس کو روک سکتی ہے۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ مایوسی سے پہلے مایوس ہو جانا تقاضائے خرد نہیں۔ بلکہ جب تک رجا و امید کا رشتہ قائم ہے اس کو خواہ مخواہ توڑا کیوں جائے اور بلا وجہ پریشانی کو دعوت کیوں دی جائے۔ اصل بات یہ ہے کہ ان کی رجائیت کسی فلسفہ کا نتیجہ نہیں تھی بلکہ ان کا مزاج ہی رجائیت پسند تھا۔ یوں بھی ان دونوں فلسفوں میں، فلسفہ اور نقطۂ نظر کا اختلاف اس درجہ نہیں ہے جس درجہ مزاج اور طبیعت کا ہے۔

ایک نہایت ہی پیاری ادا ان کی یہ تھی کہ جب بڑے بڑے مالداروں اور عہدہ داروں سے ملتے تھے تو انہیں اپنی سطح پر لا کر بات چیت کرتے اور جب چھوٹوں اور عزیزوں سے گفتگو کرنے کی نوبت آتی تو کسی طرح بھی ان میں کسی کمتری کا احساس نہ پیدا ہونے دیتے۔

اسلام سے متعلق ان کا خاص نقطۂ نظر تھا۔ اور وہ یہ تھا کہ جب تک اس کی از سر نو تعبیر و ترجمانی نہ کی جائے اور اس کی عمارت کو بالکل ہی نئی بنیادوں پر قائم نہ کیا جائے اس وقت تک نئے ذہن اسے قبول نہیں کر سکیں گے۔ ان کا خیال تھا کہ الٰہیات سے لے کر فقہ اور معاشرت تک کے مسائل پر پھر سے غور ہونا چاہیئے۔ اور چونکہ جدید فلسفہ کی تمام شاخوں پر ان کی نظر بہت گہری تھی اس لیے قدرتاً ان کی یہ خواہش تھی کہ اسلام کی نئی صورت اظہار (REPRESENTATION) بالکل جدید پیمانوں اور اصطلاحوں کو ملحوظ رکھ کر ہونی چاہیئے۔ اس باب میں لطیفے کی بات یہ ہے کہ جب پرانے انداز کے علماء سے ان مسائل پر گفتگو ہوتی تو یہ خوب خوب ان کو جھنجھوڑتے تاکہ ان کے جمود میں تغیر پیدا ہو، اور جدید تقاضوں کا احساس ان میں کروٹ بدلے۔ لیکن جب جدید گروہ کا سامنا ہوتا تو ان کے مقابلہ میں ایک کٹر مسلمان کی حیثیت اختیار کر لیتے۔ مذہب میں قدامت پرستی اور تشدد (ORTHODOXY) کے خلیفہ صاحب شدید مخالف تھے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مگر اگر کوئی مستشرق پادری ذہن و فکر کا امریکن ادارے میں آ نکلتا اور اس گروہ کی مخالفت کرتا یا یہ تعدد ازدواج وغیرہ پر اعتراض کرتا تو اس کو برداشت نہ کر سکتے۔ اس وقت ان کا جوش تبلیغ، ان کی حمیت دینی، اور عصبیت اسلامی دیکھنے کے قابل ہوتی۔ رواں دواں انگریزی میں موجودہ تہذیب اور کلچر کی خامیوں کی اس فصاحت و بلاغت سے نشاندہی کرتے کہ سننے والے انگشت بدنداں رہ جاتے۔ چونکہ یورپ میں برسوں گذار چکے تھے اس لیے ان لوگوں کی کمزوریوں سے اچھی طرح واقف تھے۔

ان کے فضائل کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ بحیثیت مجموعی ان کی شخصیت بہت جاذب اور پیاری تھی۔ میں جب پہلی دفعہ ان سے ملا تو حسب عادت مسئلہ اجتہاد پر ان سے خوب خوب جھڑپیں ہوئیں۔ پھر جب انہوں نے دیکھ لیا کہ میں عقائد کے معاملہ میں انہی کی طرح جذباتی ہوں اور جذبات کے ساتھ ساتھ دلائل بھی رکھتا ہوں تو بہت خوش ہوئے اور اسی مجلس میں کہہ دیا کہ میں اس مسئلہ کے ما لہٗ اور ما علیہ پر ایک تفصیلی کتاب لکھوں جس میں تمام ادلہ پر سیر حاصل بحث ہو۔ اور جس میں یہ ثابت کیا جائے کہ اسلامی اجتہاد میں جدید سے جدید تقاضوں کو سمو لینے کی پوری پوری صلاحیت موجود ہے۔ چنانچہ میری کتاب مسئلہ اجتہاد کا نقشہ قریب قریب اسی جھڑپ کے بعد مرتب ہوا۔

مضمون تشنہ رہے گا اگر عام معاملات میں خلیفہ صاحب کے اصول کار کی وضاحت نہ کی جائے۔ اس سے پہلے یہ بتایا جا چکا ہے کہ ان کا فلسفۂ حیات رجائیت پر مبنی تھا۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ ہر شخص کو اولاً پیکر خیر سمجھتے اور اس وقت تک اس کے بارے میں حسن ظن ہی سے کام لیتے جب تک واقعات و حقائق سے یہ ثابت نہ ہو جاتا کہ یہ شخص اچھا نہیں ہے۔ یہ اصول ان کی طینت میں اس درجہ راسخ اور رچا ہوا تھا کہ قبل از وقت کسی شخص کے بارے میں ان کو یہ یقین دلانا سخت مشکل تھا کہ یہ شخص قابل اعتماد نہیں ہے۔

آخر میں ایک خوبی اور سن لیجئے۔ وہ جہاں جدید تعلیم سے لیس اور خیالات و افکار میں بالکل الٹرا ماڈرن تھے۔ وہاں تصوف اور صوفیاء کے بے حد قائل تھے اور اس سلسلہ میں بعض ایسی چیزوں کے بھی قائل تھے عام حالات میں جن کی توقع ان سے نہیں کی جا سکتی تھی۔ مثلاً وہ برملا کہا کرتے تھے کہ یہ عالم ہست و بود صرف مادیت ہی پر مبنی نہیں ہے۔ اور یہاں جو کچھ بھی ہے وہ مادہ ہی کے اظہار و نمود کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ اس کے پہلو بہ پہلو اسی دنیا میں ایک روحانی عالم بھی آباد ہے جس کا اس عالم اسباب سے گہرا تعلق ہے۔ میری ذاتی رائے یہ ہے کہ اگر خلیفہ صاحب کی زندگی کا سلسلہ اور دراز ہوتا تو وہ فطری طور پر افکار و جذبات کے اس موڑ پر پہنچ گئے تھے جہاں ایک شخص ترک دنیا اختیار کر لیتا ہے اور صرف اعلیٰ روحانی اقدار کے حصول کے لیے زندہ رہتا ہے۔ ان کی سیرت و کردار کی تبدیلیوں کا جہاں تک میں نے مطالعہ کیا ہے وثوق اور یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اگر ان کو اور مہلت مل جاتی تو ان کے رجحانات ایک نہایت اعلیٰ درجہ کے فلسفی و صوفی کی شکل اختیار کر لیتے۔ یہی ان کی منزل اور نصب العین تھا۔ آخر ایک عاشق رسولؐ، رومیؒ اور اقبال کا شیدائی اپنے لیے اس سے کم درجہ کو پسند بھی کیوں کرتا؟

© rasailojaraid.com